ISSN: 2789-6331
pISSN:2789-4169

CC BY
OPEN ACCESS

فرزانہ رمضان
پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو و مشرقی زبانیں، جامعہ سرگودھا، سرگودھا
ڈاکٹر محمد نعیم
ایسوسی ایٹ پروفیسر، ادارہ زبان و ادبیات اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Farzana Ramzan
Ph.D. Scholar, Dept. of Urdu & Oriental languages, University of Sargodha
Dr. Muhammad Naeem
Associate Professor, Institute of languages and literature, Punjab University, Lahore

ناصر کاظمی کی غزل میں تاریخی شعور

HISTORICAL AWARENESS IN NASIR KAZMI'S GHAZAL

ABSTRACT

Nasir Kazmi is a great and well-known poet of Urdu Ghazal. He broadened the canvas of Urdu Ghazal at the ascension of Urdu Nazm. There is too much diversity in his topics. He has not only described the topics of modern times and the conflicts of the current time but also the historical events of partition, the economic condition of Pakistan, the grief of migration, the sorrow of loneliness, memories of the past, and the situation of human life and problems of that era. Nasir is the poet of imagery, the fantasy of nature, personification, and monologue. He created landscapes and created new and different characters also. He used the flashback technique throughout his whole poetry, especially in the Pehli Barish. He reflects historical consciousness in his poetry. This research paper specifically focuses on the historical consciousness prevalent in Nasir Kazmi's Ghazal.

KEYWORDS

Urdu Ghazal, Partition, Historical, Consciousness, Imagery, Personification, Nature, Remembrance.

1947ء کے فوراً بعد غزل گو شعراء کی جو نسل سامنے آئی ان میں سب سے نمایاں اور اہم نام ناصر کاظمیؔ کا ہے۔ یاد، فطرت، ہجرت، تمثال اور تجسیم کاری کی چادر اوڑھے ناصر کی شاعری اپنے اندر اپنی تاریخ کی تمام تہذیب و ثقافت، آشوبِ زمانہ، عشق و حسن کے انوکھے انداز کو چھپائے ہوئے ہے۔ نظم کے عروج کے دور میں غزل کہنا اور غزل پڑھنا آسان نہ تھا مگر ناصرؔ زمانۂ طالب علمی ہی سے مشہور ہو چکے تھے۔ 1941ء، 42ء کے قریب ناصرؔ انبالہ سے حصولِ تعلیم کے لیے لاہور آئے اور بی۔اے ادھورا چھوڑ کر واپس پلٹ گئے۔ مگر

اس عرصہ میں لاہور جیسے ادبی مرکز میں ناصر کاظمی کئی مشاعرے پڑھ چکے تھے۔ حفیظ ہوشیار پوری کے ذریعے ان کی غزل ریڈیو پاکستان پر سامعین کی سماعتوں کو معطر کر چکی تھی حتیٰ کہ احمد ندیم قاسمی نے جب ناصر کی غزل سنی تو بے اختیار کہا:

> ناصر محدود شاعر نہیں ہے، وہ متنوع موضوعات کا شاعر ہے اور زندگی کے حسن کے سیکڑوں پہلوؤں اور اس کی رنگا رنگی کا شاعر ہے اور اس حسن اور رنگا رنگی کو سب کے لیے عام کر دینے کی امنگ رکھنے والا شاعر ہے۔ (i)

ناصر آغاز میں اختر شیرانی سے متاثر تھے لہٰذا غزل میں موجود حسن و عشق اور معاملاتِ قلبی و رموزِ داخلی و خارجی کو سمجھ چکے تھے۔ فطرت آغاز سے ہی ناصر کی ہم راز و ہم نشیں رہی، انبالہ میں فطرت سے ہونے والی دوستی اخیر عمر تک ان کے ساتھ رہی۔ پتوں کی تالیاں سننا، درختوں کی سرگوشیاں، پرندوں تتلیوں کا اپنے رنگ و آواز پہ ناز، سرسوں کے پھول، جاگتی راتیں، یہ سب انبالہ سے ہی ناصر کی زندگی کا حصہ بنے، ان مناظر کو زادِ راہ بنا کر ناصر نے بہت سے پہاڑی مقامات کی سیر کی اور سرسبز و شاداب وادیوں میں، پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں، چشموں اور فطرت کے رنگوں سے بھرپور مناظر کو دل میں بسالیا۔ انبالہ میں ناصر کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا، اس شہر میں بادل بجلی کی کڑک اور چمک دیکھی تھی، ریل اور باغات دیکھے، اس شہر میں بارش کی پہلی دعا مانگی تھی، انبالہ سے لاہور آمد پہ ناصر کے دل پہ حیرانی کا دوسرا در وا ہوا۔ باغ، پرندے تارے، آسمان، آتے جاتے موسم، رتجگے، یاروں کی محافل اور محبتوں کی مہکاریں، رات گئے باتوں کی بارشوں میں بھیگنا، ناصر کی شاعری کے یہ سب موضوعات لاہور کی زندگی کے دیئے ہوئے ہیں۔ ناصر کی شاعری کے رنگ اس لیے بھی انوکھے اور نرالے ہیں کہ اس نے عین نظم کے عروج میں غزل کو عزت بخشی۔ ناصر کی غزل سنتے ہی فراق جیسے کہنہ مشق شاعر نے کہا تھا:

> ناصر کاظمی کے لہجے میں وہ کھٹک اور کھنک ہے، جس میں ہندوستان اور پاکستان دونوں میں بسنے والے اپنے دلوں کی دھڑکنیں سنیں گے، یہ کوئی معمولی صفت نہیں ہے۔(ii)

غزل کی صنفی حیثیت پر جب مختلف تحریکوں کی بدولت اعتراضات کیے جا رہے تھے اور نظم کا فروغ مسلسل عمل میں آ رہا تھا تو بے چاری غزل کہیں پاتال میں پڑی کسی محسن کی منتظر تھی، جو اس کی بازیافت کرے اور اسے دوبارہ مجموعی سطح پر رائج کرے اور اس پر بے جا اعتراضات کو رفع کرے۔ اسے ماتھے کا جھومر بنائے۔ پہلے ترقی پسندوں نے کہا کہ غزل محض روایت کی خوشہ چینی کا نام ہے، اسے ترک کر دینا چاہئے اور اگر برقرار بھی رکھا جائے تو اسے مقصدیت کے ساتھ پیدا ہونا چاہیے، ورنہ اس کی گردن مار دینی چاہیے۔ بعد میں حلقہ ارباب ذوق والے آئے تو انھوں نے بھی اسے ہی اپنا ہدف بنایا اور اور تیر و تفنگ کی بارش کر دی لیکن آخر غزل نے فروغ پانا تھا اور ایک بار پھر ملکی سطح پر اس کی پگڑی بلند ہونی تھی۔ اس دور کو ہم "احیائے غزل" کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔ بعض مصنفین نے اس دور کے تحت کی جانے والی تمام شاعری کو "پاکستانی ادب" سے موسوم کیا ہے لیکن اس نام کو اختیار کرنے میں چند قباحتیں ہیں جنہیں سلیم احمد نے اپنے

ایک مضمون "پاکستانی ادب کا مسئلہ" میں تفصیلی بیان کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانی ادب کی انفرادیت کو ثابت کرنے کے لیے کوئی کلید نہیں ملتی۔([iii])

احیائے غزل کا دور 1958ء میں مارشل لاء لگنے کے بعد اپنی آواز کو دبانے کی کوششوں کے خلاف، ظلم سے واسطہ پڑنے پر سامنے آیا۔ اس رجحان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، ممتاز شیریں، سجاد باقر رضوی، سلیم احمد، انتظار حسین، ناصر کاظمی اور احمد مشتاق شامل ہیں اس دور کے شعراء کے ایک گروہ نے (جن کے سرخیل ناصر کاظمی تھے) غزل کی اس روایت کو دہرایا، جس کے بانی "میر تقی میر" ہیں۔

محمد حسن عسکری نے جب ناصرؔ کی غزل سنی۔ اس کی وارفتگی کا عالم یہ تھا کہ غزل سنتے ہی فوراً نقل کروادی اور 1949ء کے "ساقی" میں شائع کر دی اور "جھلکیاں" میں اعلان کر دیا کہ پاکستان کو بالآخر ایک شاعر میسر آ گیا۔([iv]) حسن عسکری کے اسی قول کو بنیاد بنا کر بعض نقادوں نے "پاکستانی ادب" کی اصطلاح تراشی ہے اور ناصرؔ کاظمی کو اس کا نمائندہ شاعر گنوایا ہے۔ پاکستانی ادب کی حیثیت کیا ہے؟ اس حوالے سے سلیم احمد کا مضمون کارآمد ہے۔ ناصر نے ترقی پسندوں اور اسلامی اور پاکستانی ادب والوں سے الگ غزل کی سرزمین میں ایک نیا راستہ نکالا جو آگے چل کر نئی نسل کا راستہ بنا۔ سلیم احمد لکھتے ہیں:

> ناصر کی شاعری میں یاد اور اداسی سب سے مضبوط استعارہ ہے۔ اسی کے ذریعے ناصر نے حسن و عشق کے وہ معاملات سمیت تمام مناظر کی عمارت تعمیر کی ہے۔([v])

ے پھر کسی یاد نے کروٹ بدلی کوئی کانٹا سا چبھا ہے دل میں
ے جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ
ے اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
ے ہر خرابہ یہ خبر دیتا ہے میں بھی آباد مکاں تھا پہلے
ے دکھ کی لہر نے چھیڑا ہوگا یاد نے کنکر پھینکا ہوگا

ناصر کا رشتہ اپنی زمین سے اپنی مٹی سے بہت گہرا ہے، اسی زمین کے توسط سے پرند، درخت، چشمے، ندیاں، دریا، باغ، مٹی، بارش، چاند اور مٹی سے جڑی ہر چیز سے ناصر کی نسبت ہے۔ مٹی لامحالہ کسی تہذیب سے جڑی ہے اور ناصر کی شاعری اپنے شہروں، دوستوں، راستوں، علاقوں، اداسیوں، رت جگوں، پت جھڑوں، یادوں، وغیرہ کے استعاروں کے ذریعے اپنے ماضی کی بازیافت کا ذریعہ بنتی ہے۔ ناصر کے ہاں تاریخی شعور کی بازیافت میں سب سے معاون اور مضبوط یاد اور اداسی کا استعارہ ہے۔ دراصل ناصر کی زیادہ شاعری یاد ہی کا عمل اور تسلسل ہے۔ احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ ماضی کی یاد ہر انسان کا جذباتی سرمایہ ہوتا ہے۔([vi]) ناصر کا کمال ہے کہ اس نے شاعری میں یادوں کو تخلیقی وفور کا مرقع بنا دیا ہے اس میں ماضی و مستقبل دونوں کے چراغ روشن کر دیئے ہیں۔ ناصرؔ ماضی کو یاد رکھتے ہوئے مستقبل سے بھی رشتہ استوار کرتا ہے۔ ناصر کی اداسی خود آگہی کی تعمیر کرتے ہوئے پُرسکون معاشرے کے خواب دکھاتی ہے اور یہی ماضی سے مستقبل

کی طرف سفر کی آئیڈیالوجی اسے دیگر ہم عصر شعرا سے ممتاز و نمایاں کرتی ہے۔ ناصؔر کے ہاں ہجرت اور اس سے جڑے سانحات کا صرف ملال نہیں ہے بلکہ اس میں مستقبل کے لیے بھی الاؤ روشن ہیں بقول سلیم احمد "ناصؔر جلے ہوئے بسیروں میں نئی نسل کا سراغ ڈھونڈ رہا تھا"([vii])ڈاکٹر حسن رضوی نے لکھا ہے کہ:

> ناصؔر نے اپنی غزل میں تخلیقی بازیافت اور خود آگاہی کی خوشبو سے ماضی، حال اور مستقبل کی تہذیبی، ثقافتی مہکاروں سے آشنا کیا۔([viii])

ے یہ شب یہ خیال و خواب تیرے — کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
ے دیتے ہیں سُراغ فصلِ گُل کا — شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
ے آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں — یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
ے جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو — بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

ناصؔر کی غزل، نظم کے دور میں اس لیے سراہی اور چاہی گئی کیونکہ اس وقت مغربی شعرا جن مہارتوں کا استعمال کر رہے تھے۔ وہ ناصؔر نے اپنی غزل میں برتیں۔ ناصؔر کی شاعری عشقیہ ضرور ہے مگر اس نے حسن کے روایتی سانچوں کو تبدیل کر دیا، یہی وجہ ہے کہ ناصر کی شاعری کا نیا پن اسے متروک نہیں ہونے دیتا۔ ناؔصر کا تخیل بلند اور وسیع ہے۔ اس نے خارجی مظاہر کے بیان سے دراصل دل کا حال بیان کیا ہے۔ اس پر بات نہ بھی کرتے ہوئے اجتماع کے دکھ کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے خود ناصر کاظمی لکھتے ہیں "اچھا لکھنے کا مطلب ہے کہ اپنا لکھے۔([ix])

ناؔصر کاظمی میرؔ کے خوشہ چیں ہیں مگر میرؔ کے پیروکار نہیں ہیں ۔ ناصر کے حالات میرؔ سے مماثل بھی ہیں اور دونوں کے افتراقات بھی بہت ہیں۔

ناصر کاظمیؔ نے اس دور کے شعری رجحان کے متوازی اپنی ذات، اپنی زندگی سے رشتہ استوار کر کے اجتماعیت سے دوری اختیار کی اور اسی طرح ہنگامی نوعیت کے مسائل کے بیان کی جگہ آفاقی مسائل کی طرف توجہ دی جو کہ نیا انداز ہونے کے باعث سراہا گیا۔ اگر یہ کہیں کہ علامہ اقبال کے بعد ناصر کاظمیؔ نے مرتی ہوئی غزل کو زندگی بخشی اور دلی کی طرح بار بار بیوہ ہوتی غزل کو سہاگن کا درجہ دیا تو غلط نہ ہو گا۔ ناصرؔ کے نزدیک غزل میں کلیشے کی روایت نے ہی اس کو کمزور بنایا ہے۔ ناصرؔ کے ہاں درد کی کسک، محبت کی مدھم آنچ، نراس کے ساتھ آس اور روشن دنوں کی نوید بھی ہے۔ ناصرؔ کو نئی غزل کا علمبردار یہی وصف بناتا ہے۔ 1947ء کے سانحے کے بعد پاکستانی شعرا کا سب سے بڑا المیہ وہ احساس تھا جسے ہجرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یوں تو تاریخ میں ہجرت کے واقعات کثرت سے موجود ہیں لیکن آخر کیا وجہ تھی کہ بالخصوص پاکستانی شعرا کے ہاں اس ہجرت کے بعد بھی عدم اطمینان، داغ داغ اجالا، شب گزیدہ سحر، المناکی، ذہنی ناآسودگی، گھبراہٹ اور اپنی اصل سے ہٹ جانے کا غم بہت دیر تک تازہ رہا۔ کیا وجہ تھی کہ شعرا و ادبا جیسا حساس طبقہ اس آزادی کو بھی کسی نئی شب

کا استعارہ سمجھ رہا تھا۔اس کا جواب تلاش کرنے سے قبل ہم اس ہجرت کو اور انسانوں کے اس بہت بڑی تعداد میں اپنے آبائی مکانوں، محا ّوں، زمینوں کو چھوڑ دینے کو ایک نام دے سکتے ہیں یعنی" جبری ہجرت"۔ فطرتِ انسانی پر یہ ہجرت جبر کا تازیانہ بن کر برسی۔اسی وجہ سے ہجرت زدگی کا ملال قیام پاکستان سے تین دہائیوں تک سنائی دیتا رہا۔یہ ہجرت ہمیشہ کے لیے تھی اور بھارت سے پاکستان آنے والے ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے آئے تھے، بہت پیچیدہ اور گھمبیر صورتِ حال تھی، کسی ناگہانی آفت کی طرح نازل ہونے والی یہ ہجرت برِ صغیر کے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کے لیے جبری ہجرت ہی تو تھی۔(x) پھر اس ہجرت کے ساتھ جو امیدیں وابستہ تھیں وہ بھی پوری ہوتی نظر نہیں آئیں۔

ہجرت کے اس سانحے کے بعد ظاہر ہے معاشرے کے حساس ادارے اور افراد کے ہاں اس کا گہرا اور شعوری ادراک پایا گیا، اور ادیب طبقے نے اس کا منضبط اور شدت انگیز اظہار بھی کیا۔اس ضمن میں شعرا کا کلام دیکھا جا سکتا ہے، جنھوں نے ہجرت کا سانحہ خود اپنی ذات اور خاندان پر سہا ہے جنھوں نے سرِ عام اپنی لٹتی عزتیں دیکھیں، جلتے گھر اور بے گھری کی عمومی فضا اور قتل و غارت کی شدید ہوا کا سامنا کیا ہے، ان شعرا میں سرِ فہرست ناصر کاظمی ہیں۔ناصر کے ہاں ہجرت زدگی کے ملال کی چند جھلکیاں پیش کی جاتی ہیں۔

- انبالا ایک شہر تھا، سنتے ہیں اب بھی ہے — میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریئے کی روشنی
- جنھیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصر — وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں
- رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ — لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
- کیا کہوں اب تمھیں خزاں والو! — جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ
- آج غربت میں بہت یاد آیا — اے وطن تیرا صنم خانۂ گُل
- رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصر — پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

شفیق الرحمن الٰہ آبادی، ناصر کاظمی کے ہاں ہجرت کا غم تلاش کرتے ہیں، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ان کی شاعری میں قافلوں کے رکنے اور چلنے ،اور لوگوں کے بچھڑنے کا تذکرہ ہر آن ملتا ہے۔ہجرت اور فسادات کے تناظر میں انہی رویوں کی وجہ سے ناصر کی غزل نے نئی غزل اور نئے طرزِ احساس کی نقابت کی۔عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی خواہشات کا دم توڑنا ثابت کرتا ہے کہ انسانوں کے جم غفیر میں بھی وہ خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں(xi)

تقسیم کے اس عمل سے جو گھاؤ ناصر کے دل پہ لگے انہوں نے ہمیشہ ناصر کو اضطراب میں رکھا، ہجرت اور اداسی ان کی زندگی اور شاعری پہ تمام عمر اثر انداز ہوتی رہیں ۔ناصر کی شاعری میں اداسی ، تنہائی اور محرومیوں کے اظہار کا سب سے بڑا سبب ہجرت ہے۔

(xii)ناصر کاظمی نے فسادات اور ہجرت کا کرب خود محسوس کیا، ان کی شاعری ان سانحات کی ترجمان بنی۔ ہجرت کے بعد مہاجرین کے لیے بڑے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ نئی آبادکاری اور معاشی و معاشرتی مشکلات پر قابو پانا تھا۔ عمومی سطح پر یہ مشکل ہر حساس اور افرادی قوت رکھنے والے خاندان کے لیے جلد حل ہونے والی نہ تھی لیکن شعوری و فکری سطح پر اس سے ادیبوں اور شعرا نے جن نتائج اور امکانات کا استخراج کیا، اس کے تفصیلی مشاہدے کے بغیر ہم عام انسانی سطح پر آبادکاری کے بڑے مسائل کا نہ صرف اِدراک نہیں کر سکتے بلکہ حسّی سطح پر اثر قبول کرنے کی حالت سے بھی گریز پا رہیں گے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں بھی آبادکاریوں کے مسائل اور معاشی مشکلات کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً مختلف ناولوں میں مہاجرین کی بے سر و سامانی، بے گھری اور آبادکاری کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس ضمن میں بعض مصنفین نے مہاجرین کے مختلف رویوں کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس سے نہ صرف مہاجرین کی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہوتی ہے بلکہ یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ مہاجرین کے مختلف درجے اور طبقے وجود میں آ چکے تھے۔ کچھ ایسے تھے جو بلند بانگ واویلا اور آہ وزاری کرتے رہتے۔ بعض ایسے بھی تھے جو ڈرے سہمے، شرمندہ شرمندہ سے اور پیچھے پیچھے پھرتے، خاموش رہتے اور کسی امداد وغیرہ کا مطالبہ نہ کرتے۔

؎ چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصر — کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اداسی ہے
؎ کھلی جو آنکھ تو کچھ اور ہی سماں دیکھا — وہ لوگ تھے نہ وہ جلسے نہ شہر رعنائی

الغرض ہجرت کے بعد بے گھری کا کرب اور آبادکاری کے بڑے مسائل کا شعور جس طرح نثر نگاروں کے ہاں ملتا ہے، اسی طرح اس دور کے اُن شعرا کے ہاں اس کے واضح اثرات مل سکتے ہیں جنھوں نے بذاتِ خود اس کرب سے خود کو دوچار کیا ہے، جنھوں نے ہجرت کی اذیت کے بعد بے گھری، اپنوں کی موت اور معاشی بدحالی جیسے عذاب کو برداشت کیا ہے۔

ناصر کاظمی نے جب اس اذیت کا سامنا کیا تو خدا سے ہمکلام ہوئے کہ

؎ او میرے مصروف خدا — دیکھ ذرا اپنی دنیا
؎ اتنی خلقت کے ہوتے — شہروں میں ہے سناٹا
؎ جھونپڑی والوں کی تقدیر — بجھا بجھا سا ایک دیا
؎ خاک اڑاتے ہیں دن رات — میلوں پھیل گئے صحرا
؎ زاغ و زغن کی چیخوں سے — سونا جنگل گونج اٹھا
؎ پیاسی دھرتی جلتی ہے — سوکھ گئے بہتے دریا
؎ فصلیں جل کر راکھ ہوئیں — نگری نگری کال پڑا

"دیوان" ناصر کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں 1952ء کے بعد کی غزل ہے۔ یہ وہ عہد ہے، جب ترقی پسند تحریک کا سارا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اس مجموعے میں ناصر کا فن ارتقاء کی منازل طے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس دور میں اپنے فن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

؎ سینچی ہیں دل کے خون سے میں نے کیاریاں کس کی مجال مجھ سے چمن میرا چھین لے!

اس شعری مجموعے کی مشہور غزل میں بھی تاریخ اور یاد کا امتزاج نظر آتا ہے۔

؎ پھر ساون رت کی پون چلی، تم یاد آئے پھر پتوں کی پازیب بجی ،تم یاد آئے

؎ پھر کونجیں اتریں گھاس کے ہرے سمندر میں رت آئی پیلے پھولوں کی، تم یاد آئے

ناصر کاظمیؔ نے لاہور سے انبالہ کی طرح محبت کی اس شہر کی سڑکوں، سناٹوں، درختوں، چڑیوں سے انھیں ویسی ہی الفت تھی جیسی انبالہ سے تھی۔ اس شہر کے آشوب کا اثر ہمیں ناصر کی شاعری میں نظر آتا ہے:

؎ وہ شاعروں کا شہر وہ لاہور بجھ گیا اگتے تھے جس میں شعر وہ کھیتی ہی جل گئی

؎ میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے ٹھنڈی تھی جن کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی

؎ بے چراغ راستے سنسان، بازار بند، وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی

یہ غزل اصل میں لاہور کی تہذیبی زندگی کے اجڑنے کا نوحہ تھی۔ محفلوں کے اجڑنے کی بازگشت اور دوسرے دیس جانے والوں کے لیے آنکھیں ترس جانے کا ذکر بھی ہے۔ ہر شاعر کے ہاں اپنے مزاج کے مطابق تاریخی شعور کے وسائل استعمال ہوتے نظر آتے ہیں۔

؎ دوست بچھڑے ہیں کئی بار مگر یہ نیا داغ کھلا ہے اب کے

؎ پتّیاں روتی ہیں سر پیٹتی ہیں قتلِ گل عام ہوا ہے اب کے

ناصر کے ہاں لاہور کا نام کے ساتھ جو ذکر ہوا ہے وہ لاہور کی تہذیب اور لاہور سے محبت کو ظاہر کرتا ہے:

؎ شہر لاہور! تیری رونقیں دائم آباد تیری گلیوں کی ہوا کھینچ کے لائی مجھ کو

رونق ایک دم نہیں لگتی، اور ناصر نے تو جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے جو لاہور کی صدیوں پر مشتمل تاریخ کا فاصلہ ایک جست میں طے کرنے کے مترادف ہے۔

؎ داتا کی نگری میں ناصرؔ! میں جاگوں یا داتا جاگے

داتا کی نگری بھی صرف حال کی علامت کے طور پر استعمال نہیں ہوا بلکہ صوفیا کی قدیم اور طویل جدوجہد کا ایک باب ہے۔ جس کو شاعر نے داتا کی نگری کہا وہ شہر لاہور پہلے بھی قائم تھا مگر 1039ء میں جب ابوالحسن علی بن عثمان غزنوی اپنے پیر و مرشد کے حکم سے لاہور تشریف لے آئے اور بعد میں معین الدین اجمیری نے چلی کشی کے بعد اُن کے مزار سے جاتے ہوئے شعر کہا:

؎ گنج بخش فیض عالم مظہرِ نورِ خدا ناقصاں را پیرِ کامل ، کاملاں را رہنما

اسی شعر سے داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہو گئے اور اسی لیے داتا صاحب بھی پکارے جاتے ہیں۔ گویا ناصر نے ایک شعر میں صوفیا کی تہذیب و تعظیم اور جدوجہد کو سمو دیا ہے۔

پاکستان کے استحصالی نظام کو بھی ناصرؔ نے اپنے اشعار میں کہیں کہیں بیان کیا ہے۔ چند لوگوں نے مل کر تمام عوام کا حق چھینا اور ان کے حقوق پورے نہ کرنے کا المیہ اور نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی یہ سب ایک حساس شاعر کی نظر سے کیسے بچ سکتا ہے:

؎ چند گھرانوں نے مل کر کتنے گھروں کا حق چھینا ہے

؎ باہر کی مٹی کے بدلے گھر کا سونا بیچ دیا ہے

باہر کی مٹی کے بدلے گھر کا سونا بیچنا عصری شعور بھی ہے اور اس پر ماضی کا اطلاق بھی ہوتا ہے۔ کہ مائیں بیٹوں کو ملک سے باہر بھیجنے کے لیے اپنے زیور بیچتی آئی ہیں۔ اور یہ بھی کہ وطن کی عزیز ترین مٹی کے بدلے ہم چند روپے کمانے کے لیے دیارِ غیر کا رُخ کرتے ہیں اور غربت میں عمریں گزار دیتے ہیں۔ ناصرؔ کاظمی کے ہاں مصوری، موسیقی، گیت، کہانی، اساطیر اور شاعری کا عجب امتزاج ہے، جو ناصر کے آئینہ خانہ کو رنگوں سے بھر دیتا ہے۔ ان کا کلام اپنی تفہیم میں ہر طرح کے تاریخی شعور سے بھرپور ہے۔

بقول سہیل احمد خان:

> ناصرؔ کا سفر شہروں کے اجڑنے، قافلوں کے لٹنے اور اڑتی ہوئی خاک کے درمیان شروع ہوا تھا اور ساحلوں پر گانے والوں اور کشتیاں چلانے والوں کے گم ہونے پر ختم ہوا۔ (xiii)

؎ وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

؎ جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

؎ یہاں تک آتے ہیں چھینٹے لہو کی بارش کے وہ رن پڑا ہے کہیں دوسرے کنارے پر

؎ ہیں گھات میں ابھی کچھ قافلے لٹیروں کے ابھی جمائے رہو مورچے کنارے پر

ناصر کاظمیؔ کے ہاں تاریخی شعور اتنا واضح اور صاف ہے کہ اس سے ہم باآسانی ناصر کی آنکھ بن کر تاریخ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ناصرؔ کی

شعوری حدود کا آغاز ان کی فطری حسِ ادراک سے شروع ہو کر اکتسابی حوالوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ ناصرؔ نے اس شعری سفر میں کہیں اگر پڑاؤ ڈالا ہے تو وہ پڑاؤ زمینی اور فطری پڑاؤ ہی ہے۔ غالب کی طرح ان کا پڑاؤ ایک جست میں آسمان تک نہیں پہنچتا۔ ناصرؔ نے شعوری طور پر میرؔ، فراقؔ، اور فانی اثر قبول کیا ہے۔ وہ ناصرؔ کا تاریخی شعور خود ان کا ساختہ ہے۔ چبایا ہوا نوالہ نہیں۔ ناصرؔ تاریخ کے ہر موڑ کو فطرت کی سچائی تصور کرتے ہیں اور اسے اتنا ہی بامعنی سمجھتے ہیں، جتنا مستقبل کو بامعنی بنانے کی کوشش کر کے اسے معنی دیا جا سکتا ہے۔ اس معنی کے مطابق ناصرؔ کا تاریخی شعور خاص فلسفیانہ ضرور ہو جاتا ہے لیکن اس کے تمام حسی حوالے انسان کے ذہن ہی کے تمام

شاخسانوں سے متعلق رہتے ہیں، غیر فعال یا غیر حاضر نہیں رہتے۔ ناصر کاظمیؔ کے تاریخی اور سماجی شعور کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز احمد نے درست کلید دریافت کی ہے:

> ناصر کاظمی اپنے دوسرے ہم عصر شعرا کی طرح حقائق سے نظریں نہیں چراتے بلکہ بہت قریب سے ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کا سماجی شعور پختہ اور معنیٰ خیز ہے۔ وہ ایک سچے شاعر کی طرح حقائق کے بیان میں مصلحت سے کام نہیں لیتے یہی وجہ ہے کہ جہاں ان میں حال سے بے اطمینانی پائی جاتی ہے وہیں وہ ایک خوشحال مستقبل کی بشارت بھی دیتے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ حالات بدلیں گے۔ اس لئے وہ سب کو آواز لگا کر بیدار کرتے رہتے ہیں۔ (xiv)

ناصر کو اپنی شاعری کے آفاقی ہونے کا بخوبی ادراک تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وقت کی کیا ضرورت ہے؟ اور کس قسم کی شاعری کرنی چاہیے یا کس طرزِ اظہار کو پسند کیا جائے گا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

؎ عروج پر ہے میرا وقت ان دنوں ناصر — مری غزل میں دھڑکتی ہے وقت کی آواز
؎ ڈھونڈیں گے لوگ مجھ کو ہر محفلِ سخن میں — ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا
؎ ہم نے آباد کیا ملکِ سخن — کیسا سنسان سماں تھا پہلے

ناصر کے یہ اشعار بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ اپنے ماضی کی بازیافت کے ساتھ ساتھ اپنے حال کی آواز ہیں اور مستقبل کی ضرورت بھی ہیں۔ ناصر کاظمیؔ نے اگرچہ اپنی شاعری میں ذاتی واردات کو بھی موضوع بنایا ہے۔ مگر ان کے ذاتی تجربات و واقعات کے ذریعے ہی ہم ان کے عہد کے تاریخ، سماج، معاشی، معاشرتی صورت حال اور دیگر تمام عوامل کو جان لیتے ہیں، جن سے ناصر کے تاریخی شعور کی پرورش ہوئی۔ تاریخی شعور اپنی تمام تر جہات میں فرد کا اکتسابی عمل ہوتا ہے اور اس کی کلید سماجی، معاشرتی، معاشی، نفسیاتی اور قومی شعور سے حاصل ہوتی ہے۔ ناصرؔ نے جس عہد میں شاعری کی اس عصر کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ شعراء و ادباء کے تاریخ سے جڑے رہنے کی ایک عام روش کا باقاعدہ اجرا ہو چکا تھا۔ ناصر نے اپنی شاعری میں تاریخ کے حوالے سے، انسان اور تاریخ کے تعلق کے حوالے سے شعور و ادراک کا مظاہرہ کیا ہے۔ ناصر کے ہاں ماضی اور حال دونوں اس حوالے سے ایک سانچے کے نمونے ہیں کہ ماضی سے وابستہ رہ کر حال کی نگہداشت کو اچھے اور فطری اصولوں کے مطابق کیا جا سکتا ہے ناصرؔ کے ہاں جتنا ماضی با معنیٰ ہے اتنا ان کے کسی معاصر شاعر کے ہاں با معنیٰ نہیں ہے۔ انتظار حسین سے مکالمہ کرتے ہوئے ناصر نے خود کہا تھا:

> بات یہ ہے کہ جس طرح عطر کی شیشی آپ کھولتے ہیں تو خوشبو آپ کو آتی ہے تو پھول اور باغ نظر نہیں آتے تو شاعری میں میری یہ تمام واقعات براہِ راست تو آپ کو نظر نہیں آئیں گے البتہ یہ ہے

کہ وہ جو یادیں ہیں جو زمانہ تھا ہماری غلامی کا اور جس میں ہم جینے کی کوشش کر رہے تھے۔۔۔تگ
ودو کو میری شاعری کے آہنگ میں، رنگوں میں، لفظوں میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ (xv)

وہ تمام وسائل اور قرینے جو اردو نظم اور مغربی شاعری کا خاصہ تھے، ناصر نے انہیں اپنی غزل میں اس خوبصورتی سے برتا ہے کہ غزل کا انداز ہی تبدیل ہو کر رہ گیا۔ دیومالائی اور حسی تمثال کاری، تجسیم کاری، خود کلامی کی کیفیت، فلیش بیک کی تکنیک، اساطیری کرداروں اور حوالوں کے ساتھ میں اور وہ کا کردار، مظاہرِ فطرت سے بے پناہ لگاؤ اور منظر کشی، واقعہ نگاری اور منظوم آپ بیتی کا انداز، منفرد تشبیہات و استعارات اور علامتیں قاری کو ناصر کی شعری پکچر گیلری میں حیران کر دیتی ہیں۔ یہی سب مہارتیں مل کر ہمیں اس تاریخی شعور تک رسائی دیتی ہیں جو ناصر کے تخیل میں کار فرما تھا۔

حوالہ جات

i- احمد ندیم قاسمی، ہجر کی رات کا ستارہ، مرتبہ، احمد مشتاق، (لاہور: نیا ادارہ، جنوری ۱۹۷۲ء) ص 90.91۔

ii۔ فراق گورکھ پوری،، ہجر کی رات کا ستارہ، ص ۲۷۔

iii۔ سلیم احمد، مضامین سلیم احمد، (کراچی، اکادمی بازیافت، 2009ء)، ص 781۔

iv۔ انتظار حسین،، ہجر کی رات کا ستارہ، ص ۴۳، ۴۲۔

v۔ سلیم احمد، مضامین سلیم احمد، ص 781۔

vi۔ احمد ندیم قاسمی، ہجر کی رات کا ستارہ، ص 83۔

vii۔ سلیم احمد، مضامین سلیم احمد، ص 553۔

viii۔ ڈاکٹر حسن رضوی، وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1996ء)، ص 201۔

ix۔ ناصر کاظمی، خشک چشمے کے کنارے، انٹرویو، انتظار حسین (لاہور: فضلِ حق سنز اینڈ پبلشرز، 1990ء)، ص 379۔

x۔ ڈاکٹر عابدہ نسیم، اردو ناول اور مہاجرین کے مسائل، 1947 کے تناظر میں (کراچی: انجمنِ ترقی اردو، 2018ء)، ص 46۔

xi- شفیق الرحمن الہ آبادی، ناصر کاظمی کی شاعری میں ہجرت کا کرب، مشمولہ، ناصر کاظمی کا شہر غزل، مرتبہ تنویر الرحمن، لاہور، اسلامک بک سنٹر، ۲۰۱۰ء، ص ۱۷۵

xii۔ ایضاً۔

[xiii]۔ سہیل احمد خان، وہ تیر اشاعر وہ تیر اناصر، ص206۔

[xiv]۔ ممتاز احمد، ڈاکٹر، جدید غزل کا فنی، سیاسی اور سماجی مطالعہ (دہلی: روشان پرنٹرز، 2016ء)، ص124۔

[xv]۔ ناصر کاظمی،، خشک چشمے کے کنارے، انٹرویو، انتظار حسین، ص۳۵۸۔